© rasailojaraid.com

غزل کاشمیری

تفسیرِ قرآن اور اسرائیلیات

اسرائیلیات کا لفظ اسرائیل سے بنا ہے۔ اس کا اطلاق یہودی منقولات پر ہوتا ہے یا اس سے مراد یہودی ثقافت کی وہ گہری چھاپ ہے جو قرآن کی بعض آیات کی تفاسیر پر لگی ہوئی ہے۔ لیکن اسرائیلیات میں ہم وسیع مفہوم پیدا کر کے اس میں نصرانی ثقافت کو بھی شامل کر رہے ہیں۔ لہٰذا جب یہ کہا جائے گا کہ اسرائیلیات سے یہودی و نصرانی دونوں ثقافتوں کی چھاپ مراد ہے تو اسرائیلیات محض تغلیباً کہا جائے گا۔ کیونکہ ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں یہودی ہی زیادہ تعداد میں تھے۔ خود عرب انہی کی ثقافت سے زیادہ متاثر تھے اور انہی کے عقاید و اعمال کو ترجیح دیتے تھے۔

یہودی ثقافت کا تمام تر دارو مدار تورات پر تھا۔ اس الہامی کتاب کے بارے میں قرآنِ پاک بھی گواہی دیتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ (المائدہ: ۴۴)

ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور نور تھا۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس میں احکام بھی تھے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ (المائدہ: ۴۵)

اور اس تورات میں ہم نے، ان پر جان کے بدلے جان فرض کی اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلا ہے۔

یہودی تورات کا اطلاق اپنی تمام مقدس کتابوں پر کرتے ہیں، جن میں زبور بھی شامل ہے تورات کو جو کہ اسفارِ موسیٰ ہیں، عہد نامۂ قدیم کہا جاتا ہے۔ تورات کے علاوہ یہودیوں کے ہاں کچھ سنن، نصائح اور شروح بھی تھے جن کو اگرچہ خود موسیٰ نے تو نہیں لکھوایا تھا البتہ ان کے پیروکار ان سے طریقِ مشافہت سے نقل کرنے کے دعوے دار تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اسفار، نصائح اور شروح میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اضافہ ہوتا گیا۔ بعد میں جب ان کو مدوّن کیا گیا تو ان کا نام تلمود رکھا گیا۔ تلمود بہت سے یہودی ادب، قصص، تاریخ، تشریعی احکام اور بے شمار اساطیر کا مجموعہ بن گئی۔

نصرانیوں کی ثقافت کا دار و مدار انجیل پر تھا۔ قرآن نے اس کے بھی الہامی ہونے کی گواہی دی ہے:

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۥ (الحدید : ۲۷)

پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسٰی بن مریم کو بھیجا اور ہم نے ان کو انجیل عطا کی۔

عیسائیوں کی جو معتبر انجیلیں تھیں اور جن کے ساتھ رسولوں کے کچھ صحائف، خطوط اور مکاشفات شامل تھے، ان کو عہد جدید کہا جاتا ہے۔ تورات کی طرح انجیل کو بھی حضرت عیسٰی کے بہت عرصہ بعد مدون کیا گیا، اس کی روایت بھی بصورت مشافہت تھی، اس کی شروح کا بھی لکھا جانا ایک فطری امر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف قصص، اخبار اور تعلیمات کا بھی اضافہ ہوتا رہا ہے، جن کو حضرت عیسٰی سے براہِ راست حاصل کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

اگر ہم تورات و انجیل کا بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ دونوں کتابیں بعض ایسے عقاید و اعمال اور احکام پر مشتمل ہیں جن میں قرآن بھی ان کا ساتھ دیتا ہے۔ خاص کر انبیا کی تاریخ میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے[۱] اور قرآن ان کی تصدیق بھی کرتا ہے لیکن اس مشابہت میں ایک فرق بیّن ہے کہ تورات و انجیل میں بے انتہا اور بے مقصد تفصیل ہے۔ واقعات و احکام میں ہر قسم کا غث و سمین موجود ہے، مگر قرآن کسی واقعے کا صرف وہی حصہ بیان کرتا ہے جو انسانیت کے لیے باعث عبرت و موعظت ہوتا ہے۔ احکام میں وہ ایک کلیہ یا بنیادی مسئلہ فراہم کر دیتا ہے، جزئیات و تفاصیل میں نہیں پڑتا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ کسی واقعے کا لب لباب پیش کر کے آگے بڑھ جاتا ہے — مثال کے طور پر آدم وحوا اور ان کے ہبوط کا قصہ ہے، قرآن نے جنت کی تعیین نہیں کی اور نہ اس درخت کی نوع بتائی جس کے قریب آدم و حوا گئے تھے۔ نہ اس حیوان کا ذکر کیا ہے جس کی قمیص بنا کر شیطان جنت میں داخل ہوا تھا، مثلا

---

[۱] ملاحظہ ہو "عہدِ قدیم" کی کتاب الاحبار اور "عہدِ جدید" کے احکام عشرہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جگہ بتائی جہاں خروجِ جنت کے بعد آدم وحوا اترے تھے۔ لیکن تورات ان تمام واقعات کو شرح وبسط سے بیان کرتی ہے۔ مثلاً جنت عدن کے مشرق میں تھی۔ جس درخت سے آدم وحوا کو منع کیا گیا تھا، وہ جنت کے وسط میں تھا، وہ زندگی کا درخت تھا، وہ خیروشر کی معرفت کا درخت تھا۔ جس حیوان نے حوا کو بہکایا تھا، وہ سانپ کی شکل میں شیطان تھا۔ اس سانپ کو اللہ نے یہ سزا دی کہ وہ زمین پر پیٹ کے بل چلے گا اور عمر بھر مٹی کھائے گا، انسان اس کا ازلی دشمن رہے گا۔ حوا کو دردِ زہ کی سزا دی اور آدم کو کہا کہ وہ اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا۔[۲۰] مگر قرآن ان واقعات اور اس قبیل کے دوسرے تمام واقعات کو اسلوبِ موجز میں بیان کرتا ہے، وہ بسط واطناب میں نہیں جاتا۔ اسی طرح عیسٰی کا حسب نسب، ان کی جائے پیدائش اور نہ اس شخص کا ذکر ہے جس کے ساتھ مریم کے تعلقات کو انجیل بیان کرتی ہے۔ آسمان سے نازل ہونے والے دسترخوان کے کھانوں کی انواع، یا ابراہیم نے جن پرندوں کو سدھایا تھا، وہ کون کون سے تھے، سفینۂ نوح کتنا بڑا تھا، اس کی لکڑی کس درخت کی تھی، اس لڑکے کا کیا نام تھا جس کو خضر نے قتل کر دیا تھا اور گائے کا وہ کون سا حصہ تھا جس کو مقتول پر مارا گیا تھا۔[۲۱]

ظاہر ہے یہ تمام تفصیلات وجزئیات اہل کتاب کے پاس موجود تھیں، لہذا یہ ایک فطری امر تھا کہ صحابۂ کرام قرآنی ایجاز کی وضاحت کے لیے یا اطمینانِ قلب کی خاطر مزید معلومات حاصل کرنے۔ بعض غامض مسائل ایسے تھے جن کی شرح کے لیے صحابہ کرام اہلِ کتاب مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔

اسرائیلیات کے داخلے کی ابتدا

تفسیر میں اسرائیلیات کا داخلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عہدِ صحابہ ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ عہدِ صحابہ میں قرآنی تفسیر کا سب سے بڑا سرچشمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات تھی۔ آپ کے بعد دوسرا بڑا ذریعہ یہی اہلِ کتاب تھے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا کہ کوئی صحابی قرآن میں کوئی قصہ پڑھتا جو نہایت مختصر ہوتا تو وہ اس کی مزید تشریح کے لیے اہلِ کتاب کی طرف رجوع کرتا

---

۲۰ عہدِ قدیم باب ۳ پیدائش ۱۱ - ۲۱۔

۲۱ الاتقان ج ۲، ص ۱۷۷ سہیل اکیڈمی شاہ عالم مارکیٹ لاہور ۱۹۷۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاکہ اس قصے کا سیاق و سباق حاصل کر کے اصل قصے کی کنہہ کو پایا جا سکے۔ جو لوگ یہودیت یا نصرانیت ترک کر کے دائرۂ اسلام میں آئے تھے صحابہ کرام کے لیے وہ بہت بڑی غنیمت اور نعمت تھے۔ کیونکہ اسلام لانے سے قبل بھی وہ اہل دین تھے اور معلومات رکھتے تھے۔ ان صحابہ کرام میں کعب الاحبار (م ۳۲ھ) اور عبداللہ بن سلام (م ۴۳ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

لیکن صحابہ کرام اہلِ کتاب کی ہر چیز کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے اور نہ ان کی ہر بات کو مانتے تھے۔ وہ صرف وہی چیز پوچھتے تھے جو کسی واقعہ کی وضاحت کے بارے میں مطلوب ہوتی تھی۔ یا کسی چیز کو اگر قرآن نے مجمل چھوڑا ہے تو اس کی وضاحت و تبیین کے لیے اہلِ کتاب کی طرف رجوع کرتے تھے۔

اسی طرح وہ اہلِ کتاب سے کوئی ایسی بات نہ پوچھتے تھے جس کا تعلق عقیدہ یا احکام سے ہوتا تھا۔ جب کوئی عقیدہ یا حکم رسول اللہ سے ثابت ہوتا تھا تو انھیں اہلِ کتاب کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں رہتی تھی۔ البتہ قرآنی احکام و عقاید کی تقویت کے لیے بطور استشہاد وہ اہلِ کتاب کی بات ضرور سنتے تھے۔

صحابہ کرام ان اشیا کے بارے میں بھی اہلِ کتاب سے نہیں پوچھتے تھے جو قصہ کہانیوں سے متعلق ہوتی تھیں اور جن کا عقیدہ یا عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً اصحابِ کہف کتنے تھے، ان کے کتے کا رنگ کیسا تھا؟ شاہ ولی اللہ نے سچ کہا ہے کہ "صحابہ کرام اس قسم کے لایعنی تکلفات کو قبیح اور تضییعِ اوقات خیال کرتے تھے"[۴]

صحابہ کرام کا یہ تمام عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے عین مطابق تھا:

عن ابی ھریرۃ قال کان اھل الکتاب یقرءون التوراۃ بالعبرانیۃ ویفسرونھا بالعربیۃ لاھل الاسلام فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوھم وقولوا اٰمنّا باللہ وما انزل الینا[۵]

---

[۴] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۵۳ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب آرام باغ فریر روڈ کراچی ۱۹۶۰۔ فارسی سے عربی ترجمہ محمد منیر دمشقی۔ حاشیہ مولانا اعزاز علی دیوبندی۔

[۵] صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ قولوا اٰمنّا باللہ وما انزل الینا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اہلِ اسلام کے لیے اس کی تفسیر عربی میں کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو بلکہ کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا ہے اس پر ایمان لائے۔

صحابہ کرام اس قدر تحرّی کرتے تھے کہ اگر اہلِ کتاب کوئی غلط جواب دیتے تو صحابہ کرام ان کی غلطی کو ان پر واضح کر دیتے تھے اور انھیں وجہِ صواب بتا کر ان کا جواب رد کر دیتے تھے۔ بخاری کی روایت ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذکر یوم الجمعة فقال فیہ ساعة لا یوافقها عبد مسلم وھو قائم یصلی یسأل اللہ تعالیٰ شیئاً الا اعطاہ ایاہ واشار بیدہ یقللها۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن جمعہ کا ذکر کیا اور فرمایا اس میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اگر کوئی مسلمان بندہ حالتِ نماز میں اسے پالے اور اللہ سے جو کچھ مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرمائے گا۔ آنحضرتؐ نے ہاتھ کے اشارے سے اس گھڑی کے بارے میں بتایا کہ وہ چند لمحات کی ہے۔

اس گھڑی کے بارے میں صحابہ کرام میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ آیا یہ اب بھی باقی ہے یا اٹھالی گئی ہے؟ اگر باقی ہے تو کیا یہ ہر جمعہ میں آتی ہے یا سال میں صرف ایک ہی جمعہ میں آتی ہے؟ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ نے اس بارے میں کعب احبار سے پوچھا تو انھوں نے کہا یہ سال کے ایک ہی جمعہ میں آتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے ان کے اس جواب کو رد کر دیا اور کہا یہ ہر جمعہ میں آتی ہے۔ چنانچہ کعب نے دوبارہ تورات کا مطالعہ کیا تو ابو ہریرہ کی بات کو سچ پایا۔[۲]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ اس ساعت کی تحدید کے بارے میں پوچھنے کے لیے عبد اللہ بن سلام کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: "مجھے اس ساعت کے بارے میں بتاؤ اور علم کے بارے میں مجھ سے بُخل سے کام نہ لینا۔" عبد اللہ بن سلام نے کہا: وہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے۔ مگر ابو ہریرہ نے ان کا

---

[۱] ایضاً، کتاب الجمعة باب الساعة التی فی یوم الجمعة۔

[۲] ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری، ج ۲، ص ۱۹۰۔ الطبعة السابعة المطبعة الکبریٰ الامیریہ ببولاق مصر المحمیة ۱۳۲۳ھ۔ حاشیہ پر صحیح مسلم اور اس کی شرح نووی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب بھی رد کر دیا اور دلیل یہ دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس مسلمان بندے کو یہ گھڑی حالتِ نماز میں ملے"، اور جمعہ کی آخری گھڑی میں تو نماز نہیں ہو سکتی۔ اس پر عبداللہ بن سلام نے جواب دیا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: "جو آدمی نماز کے انتظار میں بیٹھے وہ نماز ادا کرنے تک گویا حالتِ نماز میں ہی ہوتا ہے"[۸] چنانچہ ابوہریرہ خاموش ہو گئے۔

مندرجہ بالا واقعہ اس بات کی صریح نشان دہی کرتا ہے کہ صحابہ کرام اہلِ کتاب کی ہر بات کو بلا چون و چرا یا آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ ہر حالت میں تلاشِ حق میں سرگرداں رہتے تھے۔ اگر اہلِ کتاب کی کوئی بات ان کے نزدیک قرینِ صحت نہ ہوتی تو اس کو فوراً رد کر دیتے تھے اور اس کے علل بھی واضح کرتے تھے۔ وہ اہلِ کتاب سے وہ بات اخذ کرتے تھے جو ان کے عقاید و اعمال کی تائید کرتی ہو، ایسا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے کرتے تھے اور حدِ جواز کے اس دائرے سے کبھی باہر نہ جاتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مقرر فرما دیا تھا۔ مثلاً وہ دائرۂ جواز یہ تھا:

بَلِّغوا عنّی ولو آیۃ وحدّثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج ومن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار[۹]

مجھ سے لوگوں تک احکام پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو، اور بنی اسرائیل سے روایت کرو، اس میں کوئی حرج نہیں، اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

اس حدیث میں بنی اسرائیل سے ایسے واقعات اور روایات بیان کرنے کی اجازت دی گئی ہے جو عبرت و موعظت کا باعث تھیں۔ وہ بھی اس شرط پر کہ بیان کرنے والا صحیح بات کہے۔ یہ بات بعید از عقل ہے کہ پیغمبر کسی غیر صحیح شخص سے روایت بیان کرنے کی اجازت دے۔ حافظ ابن حجر اس روایت کی شرح میں فرماتے ہیں:

"یعنی اہلِ کتاب سے حدیث بیان کرنے میں تم پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے یہ

۸؎ ایضاً۔ یہ جواب موطا، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

۹؎ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت نے اہلِ کتاب سے حدیث بیان کرنے سے اور ان کی کتابوں کو پڑھنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ پھر اس بارے میں وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب سے حدیث بیان کرنے کی ممانعت احکام اسلامیہ اور قواعدِ دینیہ کی پختہ جڑیں پکڑ لینے سے قبل تھی تاکہ مسلمان کسی فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ جب یہ خوف دور ہو گیا تو اس بارے میں اجازت دے دی گئی، کیونکہ اہلِ کتاب کے زمانے میں جو واقعات گزرے تھے ان کے سننے سے انسان عبرت حاصل کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضورؐ کے وَلَا حَرَجَ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تم اہلِ کتاب سے عجائب سنتے ہو ان کے سننے سے تمہارے سینے تنگ نہ ہوں، کیونکہ یہ عجائب ان کے ہاں اکثر واقع ہوئے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تم اہلِ کتاب سے روایات بیان نہ کرو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے آنحضرتؐ نے فرمایا: حدّثوا (بیان کرو) یہ امر کا صیغہ ہے اور وجوب کا تقاضا کرتا تھا (یعنی ضرور بیان کرو)۔ اس حدیث میں عدم وجوب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ امر اباحت کے لیے ہے کیونکہ ساتھ ہی وَلَا حَرَجَ آیا ہے۔ گویا اہلِ کتاب سے ترکِ تحدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کے واقعات کو حکایت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یعنی انہی کے الفاظ میں، کیونکہ اہلِ کتاب کے واقعات کے الفاظ دائرۂ ادب سے ہم آہنگ نہ تھے۔ مثلاً حضرت موسیٰ کو ان کا یہ کہنا " اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا (تم اور تمہارا رب جاؤ اور دونوں لڑو) یا یہ کہنا " اِجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا (ہمارے لیے کوئی پروردگار گھڑ دو) یعنی بعینہٖ ان الفاظ کی حکایت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

" یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل سے مراد خود اسرائیل کی اولاد ہے اور وہ ہے یعقوب علیہ السلام کی اولاد۔ تو پھر مراد یہ ہوگی کہ اس قصے کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں جو یعقوب کے بیٹوں نے اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کے ساتھ روا رکھا۔ لیکن یہ توجیہ دور از کار ہے۔

" امام مالک نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب کے جو اچھے اقوال ہیں ان کو بیان کرنا جائز ہے اور جن اقوال کا کذب ظاہر ہو جائے ان کا بیان کرنا جائز نہیں ـــــ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب سے وہ باتیں بیان کرو جو قرآن اور صحیح حدیث کے مطابق ہوں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب سے ہر صورت میں روایت بیان کرنا جائز ہے۔ چاہے اس روایت میں انقطاع یا ابلاغ ہو۔ کیونکہ ایسی روایت کو بیان کرنے میں اتصال بہت مشکل کام ہے، مگر ان میں احکامِ اسلامیہ شامل نہ ہوں گے، کیونکہ احکامِ اسلامیہ کی روایت میں اصل اصولِ اتصال شرط ہے، اور یہ قریب عہد کی وجہ سے مشکل نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

" امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ بات تو معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کی روایت کی اجازت نہیں دے سکتے جو جھوٹی ہو۔ لہٰذا حدثوا عن بنی اسرائیل کے معنی یہ ہوں گے کہ بنی اسرائیل سے وہ چیز بیان کرسکتے ہو جس کا کذب تم نہیں جانتے، اور جس صحیح روایت کو تم بیان کرنا جائز سمجھتے ہو اس کو بیان کرنے میں بھی تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ آنحضرت کے اس قول کی طرح ہے: " اذا حدثکم اھل الکتاب فلا تصدقوھم ولا تکذبوھم " یہاں جس چیز کا سچا ہونا قطعی طور پر ثابت ہوچکا ہو اس کے بیان کرنے کی نہ تو اجازت ہے اور نہ ممانعت ہے"[10] (مطلب یہ ہے کہ اگر تم بیان کرو تو کوئی حرج نہیں اور نہ بیان کرو تو کوئی گناہ نہیں)۔

حافظ ابن حجر نے جو کچھ کہا ہے اس سے ہماری اوپر والی تمام توجیہات کی تائید ہوتی ہے۔

اب رہی پہلی حدیث کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب، تو اس سے مراد اہلِ کتاب کی وہ باتیں ہیں جو صدق وکذب دونوں کا احتمال رکھتی ہیں۔ یعنی ہم ان روایات کے بارے میں کوئی حکم لگانے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے گا، کیونکہ ہوسکتا ہے وہ بات مبنی برحق ہو اور ہم اسے جھٹلا دیں، اور ہوسکتا ہے وہ غلط ہو اور ہم اسے سچ جان کر قبول کرلیں۔ دونوں حالتوں میں عذابِ الٰہی کا خطرہ ہے۔ حافظ ابن حجر ایک اور جگہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

" لا تکذبوا اھل الکتاب ولا تصدقوھم " سے مراد یہ ہے کہ جب وہ خبر دونوں باتوں کی متحمل ہو تو ہوسکتا ہے وہ نفس الامر میں سچی ہو اور تم جھٹلا دو، اور ہوسکتا ہے وہ جھوٹی ہو اور تم اس پر ایمان لے آؤ، اس طرح تم نقصان میں پڑ جاؤ گے۔ ان کی جو باتیں ہماری شرع کے خلاف ہیں ان کی تکذیب کرنے کی ممانعت بیان نہیں ہوئی، اور ان کی جو چیزیں ہماری شرع کے مطابق ہیں، ان کی تصدیق کرنے کی بھی ممانعت نہیں آئی۔ یہی بات امام شافعی نے کہی ہے اور اسی بات کو ہم سلف صالحین سے منقول پاتے ہیں[11]

حافظ ابن حجر نے اس تعارض کو ایک اور جگہ بالکل کھلے الفاظ میں دور کر دیا ہے، فرماتے ہیں:

---

[10] فتح الباری، ج ۶، ص ۳۶۱ الطبعۃ الاولیٰ مطبعہ میریہ بولاق مصر المحمیۃ ۱۳۰۰ھ

[11] ایضاً، ج ۸، ص ۱۲۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ابن بطال نے مہلّب سے بیان کیا ہے کہ یہ ممانعت (اہلِ کتاب سے پوچھنے کی) ان مسائل کے بارے میں ہے جن کی کوئی نص وارد نہیں ہوئی، کیونکہ ہماری شریعت اس چیز سے بے نیاز ہے کہ ہم اہلِ کتاب کی طرف رجوع کریں۔ جب کسی مسئلے کے بارے میں کوئی نص نہیں ہوگی تو ہم خود اجتہاد، فکر اور استدلال سے کام لیں گے۔ لہٰذا ہم ان سے پوچھنے کے بارے میں بے نیاز ہیں۔ لیکن ان سے ایسی باتیں پوچھنا جو ہماری شریعت کی تصدیق کرتی ہیں یا گزری ہوئی اقوام کے حالات دریافت کرنا، اس ممانعت میں نہیں آتے، اور قرآن پاک کا یہ فرمانا: فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ۔" (یعنی ان لوگوں سے پوچھو جو آپؐ سے پہلے اتاری گئی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے) تو اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے شخص سے پوچھیں جو اہلِ کتاب میں سے ایمان لا چکا ہو اور جو شخص ان میں سے ایمان نہیں لایا اُن سے نہ دریافت کیا جائے۔ اور اس نہی میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ایسی باتیں نہ پوچھی جائیں جو توحید، رسالتِ محمدیہ اور اس قبیل کی چیزوں اور عقاید سے تعلق رکھتی ہوں۔"[۱۲]

یہاں حافظ ابن حجرؒ نے ایک اور بات بیان کی ہے کہ وہ اہلِ کتاب جو مومن ہو چکے تھے، ان سے کوئی بات پوچھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ظاہر ہے صحابہ کرام کعب الاحبار اور عبداللہ بن سلام جیسے حضرات سے ہی مسائل پوچھتے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے، کافر اہلِ کتاب سے تو نہیں پوچھتے تھے۔

سلف صالحین کا عمل

اگر ہم تفاسیر کا بغور مطالعہ کریں تو وہ تفاسیر جو تفاسیر بالروایۃ یا تفاسیر بالمأثور کے نام سے مشہور ہیں، ان میں اگرچہ ان اسرائیلیات کا پتا چلتا ہے لیکن ان حضرات نے حتی الوسع ان سے پرہیز کیا ہے اور اگر وہ ان اسرائیلیات کو بیان بھی کرتے ہیں تو آخر میں جرح و تعدیل سے بھی کام لیتے ہیں۔ روایت کی ثقاہت اور سقم دونوں کو بیان کرتے ہیں۔ امام محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) نے جنھیں امام التفسیر والتاریخ کہا گیا ہے، اپنی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن میں اسرائیلیات

---

[۱۲] بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تسئلوا اھل الکتاب عن شیءٍ۔ فتح الباری ج ۱۳، ص ۲۸۱۔ یہاں حافظ ابن حجر نے امام عبدالرزاق اور امام سفیان ثوری سے بھی اہل کتاب سے ممانعت کی روایات درج کی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو بیان کیا ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ان روایات کی سند بیان کر دیتے ہیں اور کہیں کہیں وہ ان پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ مثلاً سورہ المائدہ کی آیات ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ ط ....

کی تفسیر میں ان تمام روایات کو بیان کرتے ہیں جو اس دسترخوان کے کھانوں کی اقسام کے بارے میں آئی ہیں۔ اس کے بعد تنقید کر کے کہتے ہیں:

"دسترخوان پر کون کون سے کھانے تھے، اس بارے میں صحیح قول یہ کہنا چاہیے کہ اس پر ماکولات تھیں۔ وہ مچھلی اور روٹی بھی ہو سکتی ہے، وہ جنت کے پھل بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کے جاننے سے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور نہ جاننے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اگلی آیت قرآن کے ظاہری معنی میں ہر بات کا احتمال رکھتی ہے" [۳۳]

اسی طرح سورہ یوسف کی آیت ۲۰

"وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ...." کی تفسیر میں قدماء کے اقوال پیش کرتے ہیں کہ وہ بیس درہم تھے یا بائیس تھے یا چالیس تھے۔ آخر میں تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اس بارے میں صحیح بات یہ کہی جائے گی کہ یوسف کے بھائیوں نے اسے چند درہم کے بدلے فروخت کر ڈالا جو غیر موزون تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ تعداد میں بیان کیا ہے اور نہ وزن میں بیان کیا ہے۔ اس بارے میں قرآن اور حدیث رسول میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ ہو سکتا ہے وہ بائیس ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چالیس ہوں۔ ان سے کم بھی ہو سکتے ہیں اور زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ جتنے بھی تھے غیر موزون تھے۔ ان کے وزن کا تعین کرنے سے دین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور ان کے معلوم نہ ہونے سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ قرآن کے ظاہری الفاظ پر ایمان فرض ہے۔ اس کے علاوہ جو اقوال ہیں، ان کا جاننا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔" [۳۴]

---

۳۳ جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۷، ص ۱۳۵۔ الطبعۃ الثانیۃ شرکۃ مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۹۵۴ء

۳۴ ایضاً، ج ۱۲، ص ۱۷۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح سلف صالحین میں عماد الدین ابو الفدا ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) کی تفسیر کو ایک اہم درجہ حاصل ہے۔ وہ بھی کثرت سے اسرائیلیات روایت کرتے ہیں، لیکن طبری کی طرح سند کے ساتھ، اور پھر ان پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ آیت ۶۷

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً . . . . کی تفسیر میں ایک عجیب وغریب قصہ بیان کرتے ہیں، جس میں بنی اسرائیل اس گائے کو تلاش کرتے ہیں اور پھر جو کچھ قدما سے مروی تھا اسے بیان کر کے کہتے ہیں: " یہ تمام سیاق عبیدہ اور ابو العالیہ اور سدّی وغیرہ سے مروی ہیں۔ اس میں بہت سا اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام بنی اسرائیل کی کتابوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جن کا نقل کرنا تو جائز ہے لیکن نہ ان کی تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب کی جائے گی۔ لہذا ہمارے نزدیک جو حق کے موافق ہوگا اسی پر اعتماد کیا جائے گا۔ واللہ اعلم [۱۵] لیکن کچھ واقعات کی تنقیح ضروری ہے جن کو مخالفین اسلام پیش کر کے نعوذ باللہ قرآن کو داغ دار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہ کرام اہلِ کتاب پر ہی تکیہ کرتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ حضرت عمرؓ کا واقعہ

مسند احمد میں ایک روایت ہے جو حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے:

انّ عمر بن الخطاب اتی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم بکتاب اصابہٗ من بعض اهل الكتاب فقرأهٗ علیه فغضب فقال امتهوكون فيها يا ابن الخطاب۔ والّذی نفسی بیدہٖ لقد جئتکم بها بیضاء نقیةً لا تسألوهم عن شیءٍ فیخبروکم بحقٍ فتکذبوا بہٖ اَوْ بباطلٍ فتصدقوا بہٖ والذی نفسی بیدہٖ لو ان موسیٰ کان حیًّا ما وسعہٗ الا ان یتّبعنی۔ [۱۶]

ایک بار حضرت عمرؓ آنحضرتؐ کے پاس ایک کتاب لا کر پڑھنے لگے جو انھیں کسی اہلِ کتاب سے ملی تھی۔ حضورؐ غصے میں آ گئے اور کہا: اے ابن خطاب! تم ان میں حیران و پریشان پھر رہے ہو؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضے

---

[۱۵] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۰۔ طبع دار احیاء الکتب العربیۃ عیسٰی البابی الحلبی و شرکاءہ مصر، سن ندارد۔

[۱۶] مسند احمد ج ۳، ص ۳۸۷ المکتب الاسلامی و دار صادر للطباعۃ والنشر الطبعۃ الاولیٰ بیروت ۱۹۶۹۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور البزار نے بھی روایت کیا ہے۔ فتح الباری ج ۱۳ ص ۳۸۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں میری جان ہے، میں تمھارے پاس ایک سفید اور پاک شریعت لایا ہوں - تم اہلِ کتاب سے کوئی چیز پوچھو گے اور وہ تم کو سچی بات بتائیں اور تم اسے جھٹلا دو اور اگر وہ غلط جواب دیں اور تم اسے سچ جان لو - اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انھیں میری پیروی کے بغیر کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا۔

مندرجہ بالا حدیث میں جو نہی واقع ہوئی ہے وہ ابتدائے اسلام میں تھی۔ یہ مسلمانوں کے دلوں میں احکامِ شرعیہ کے ٹھوس تشکل اختیار کرنے سے قبل کی بات ہے۔ ابتدائے اسلام میں تو آنحضرتؐ کی احادیث لکھنے تک کی ممانعت تھی کہ کہیں یہ قرآن کے ساتھ مختلط نہ ہو جائیں۔ لیکن جب اسلامی احکام مسلمانوں پر معروف ہو گئے اور انھوں نے پختہ بنیادیں اختیار کرلیں تو اہلِ کتاب سے روایت کی اجازت مل گئی تھی اور احادیث قلم بند کرنے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ مکمل جواب ہم فتح الباری ج ۶ اور ج ۱۳ سے اوپر دے آئے ہیں اور ابن بطّال کی زبانی مہلب کا قول پیش کر آئے ہیں۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا واقعہ

مشہور معتزلی بشر مریسی نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو جنگ یرموک میں اہلِ کتاب کی دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر کتابیں ملی تھیں، وہ انھیں آنحضرت کی طرف سے لوگوں کو بیان کرتے تھے۔ لوگ انھیں کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس ان دو بوریوں میں سے کوئی بات مت بیان کرو۔"[۱۷]

اسی طرح مشہور منکرِ حدیث محمود ابوریّہ نے بھی یہ اعتراض کیا ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

ان عبد اللہ بن عمرو کان قد اصاب زاملتین من کتب اهل الکتاب وکان یرویها للناس عن النّبی فتجنب الأخذ عنه کثیر من ائمة التابعین وکان یقال له، لا تحد ثنا عن الزاملتین[۱۸]

عبداللہ بن عمرو کو اہلِ کتاب کی کتابوں میں سے دو بوریوں کے برابر کتابیں ملی تھیں، وہ لوگوں کو انھیں آنحضرتؐ سے روایت کیا کرتے تھے، چنانچہ ائمۂ تابعین میں سے بہت سے حضرات نے ان کی حدیث قبول کرنے سے پرہیز

---

[۱۷] ردّ الدارمی علیٰ بشر ص ۱۳۶ - بحوالہ السنۃ قبل التدوین، ص ۳۵۱ مکتبہ وھبہ ۱۴ شارع الجمھوریۃ بعابدین الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۶۳ء

[۱۸] اضواء علی السنۃ المحمدیۃ، ص ۱۶۲، حاشیہ نمبر ۳ طبع دار التالیف مصر ۱۹۵۸ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا تھا۔ ان کو کہا جاتا تھا کہ ہم سے ان دو بوریوں میں سے مت بیان کرو۔

محمود ابوریّہ نے اس کا حوالہ فتح الباری سے دیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ فتح الباری میں اس طرح نہیں لکھا جس طرح محمود ابوریّہ نے لکھا ہے۔ فتح الباری میں ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر کتابوں کا ذکر ہے اور محمود ابوریّہ اسے دو اونٹ کے بوجھ کے برابر (زاملتین) لکھ رہے ہیں۔ فتح الباری میں اتنا ضرور درج ہے کہ وہ اہلِ کتاب کی یہ باتیں لوگوں سے کیا کرتے تھے، لیکن یہ کہیں ذکر نہیں ہے کہ وہ اسے آنحضرتؐ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ "عن النبی" کا اضافہ خود ابوریّہ نے اپنی طرف سے کیا ہے۔ فتح الباری کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں :

ان عبد اللہ کان قد ظفر فی الشام بحمل جمل من کتب اھل الکتاب فکان ینظر فیھا و یحدث منھا فتجنب الاخذ عنہ لذلك کثیر من ائمۃ التابعین واللہ اعلم[۱۹]

عبداللہ بن عمرو کو شام میں اہل کتاب کی ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر کتابیں ملی تھیں۔ وہ انھیں پڑھا کرتے تھے اور لوگوں سے بیان کرتے تھے۔ لہٰذا ائمہ تابعین میں سے اکثر حضرات نے ان سے حدیث اخذ کرنے سے اجتناب کیا ہے، واللہ اعلم۔

قارئین ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ بشر مریسی اور ابوریّہ دونوں نے کس طرح علمی خیانت کا ثبوت دیا ہے اور کس طرح انھوں نے اس جلیل القدر صحابی کے بارے میں سوءِ ظن کا مظاہرہ کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اہلِ کتاب کی روایات ضرور بیان کرتے تھے، لیکن ایک تو وہ انھیں آنحضرتؐ کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے، دوسرے یہ روایات اسلام کے کسی بنیادی عقیدے یا احکام کے بارے میں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ وہی روایات تھیں جو باعثِ عبرت و موعظت تھیں اور پھر عبداللہ بن عمرو جواز کے اس دائرے سے کبھی باہر نہیں گئے جو آنحضرتؐ نے مقرر فرما دیا تھا۔ امام ابنِ تیمیہ نے اس کی یہی توجیہ بیان کی ہے[۲۰]

---

[۱۹] فتح الباری، ج ۱، ص ۱۸۴۔

[۲۰] مقدمۃ فی اصول التفسیر، ص ۲۶۔ بحوالہ التفسیر والمفسرون ج ۱، ص ۱۷۵۔ محمد حسین الذہبی الطبعۃ الاولیٰ، دار الکتب الحدیثیہ، مصر ۱۹۶۱ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا واقعہ

استاد احمد امین مصری نے اسرائیلیات کے بارے میں صحابہ کرام خاص کر حضرت عبداللہ بن عباس پر تلخ تنقید کی ہے کہ وہ اہلِ کتاب سے روایات بیان کرنے میں بہت مشہور تھے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

" ان یہودیوں میں سے بعض لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور ان کے ذریعے ان اسرائیلیات میں سے بہت سارا ذخیرہ مسلمانوں میں سرایت کر گیا، اور یہی اسرائیلیات تفسیر قرآن میں داخل ہو گئیں جن سے صحابہ قرآن کی شرح مکمل کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کبار صحابہ بھی مثل ابنِ عباس کے ان کے اقوال کو حاصل کرنے میں مطلق حرج نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا جاتا ہے کہ جب اہلِ کتاب تم سے کوئی روایت بیان کریں تو نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو۔ لیکن عمل اس حدیث کے برخلاف ہوتا رہا۔ صحابہ ان کی روایات کی تصدیق کرتے رہے اور ان سے نقل کرتے رہے۔[۱۲۱]"

ہمارے نزدیک احمد امین نے سخت تحکم سے کام لیا ہے۔ صحابہ کرام بلا سوچے سمجھے کب ان سے روایات بیان کرتے تھے؟ ابو ہریرہ کی مثال ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا بھی یہی حال تھا۔ بلکہ آپ تو اہلِ کتاب سے روایات بیان کرنے میں سب سے زیادہ محتاط تھے۔

احمد امین نے اپنی جلالت علمی کے باوجود مشہور مستشرق گولڈزیہر کے اعتراض کو ہی دہرا دیا ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ گولڈزیہر کا اعتراض نقل کرکے قارئین کو بتا دیں کہ دونوں سکالروں کے بیان میں کس قدر مشابہت ہے، پھر عبداللہ بن عباس پر کیے گئے اعتراض کا جواب دیں گے۔ گولڈزیہر کہتا ہے:

" ان تمام روایات میں (جن میں صحابہ کا اہلِ کتاب سے اخذ کرنا بیان کیا گیا ہے) سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ روایت ہے کہ ابنِ عباس کو جب کسی مسئلے کے بارے میں کوئی شک پیدا ہوتا تھا تو اسے دور کرنے کے لیے ان اہلِ کتاب کی طرف رجوع کرتے تھے جن کے پاس اس بارے میں معلومات ہوتی تھیں۔ اکثر بیان کیا جاتا ہے کہ ابن عباس معانی الفاظ کی تفسیر کے لیے ابوالجلد نامی ایک شخص سے استفادہ کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص غیلان بن فروہ ازدی تھا جس کی یہ کہہ کر تعریف کی جاتی تھی کہ

---

۱۲۱ فجر الاسلام، ص ۲۰۱۔ مکتبۃ النہضۃ المصریۃ الطبعۃ السابعۃ ۱۹۵۹ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ قدیم کتابیں پڑھا ہوا ہے۔ عبداللہ بن عباس کی بیٹی یہ بات خصوصیت کے ساتھ بیان کرتی تھیں کہ ان کے والد قرآن کو ہر سات دن کے بعد ختم کیا کرتے تھے اور تورات کو دیکھ کر پڑھنے کے بعد آٹھ دن میں ختم کیا کرتے تھے۔ سات سے آٹھ دن کے اندر قرآن ختم کرنے کی ایک معتدل اور درمیانی مدت تصور کی جاتی تھی۔ عبداللہ بن عباس جب بھی تورات ختم کرتے تو لوگوں کا ایک بڑا جلسۂ عام منعقد کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایسا کرنا عملِ صالح ہے۔ اس سے خدا کی رضا مندی اور رحمت واجب ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس گنجلک اور پُرپیچ روایت سے ـــ جسے ان کی بیٹی نے مزید الجھا دیا ہے ـــ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ پڑھنے کے دوران تورات کا کون سا نسخہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اس پُر فضیلت علم کے سرچشموں میں عبداللہ بن عباس کے نزدیک دو اور انسان بھی تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ تھے کعب الاحبار اور عبداللہ بن سلام۔ اسی طرح ہم عموماً ان اہل کتاب کے گروہوں سے روایات بیان کرنے کی عبداللہ بن عباس سے ممانعت بھی پاتے ہیں۔ یہ اقوال بھی خود ابن عباس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔"[۲۲]

کاش ابن عباس کی بیٹی سیدھی سادی عورت ہونے کی بجائے گولڈ زیہر کی طرح محقق ہوتیں تو وہ اس روایت کو نہ الجھاتیں بلکہ تورات کا سنِ طباعت اور مصنف کا نام تک راویوں کو بتاتیں۔ اس طرح یہ روایت غامض ہونے کی بجائے صاف نکھر کر سامنے آجاتی۔ سچی بات یہ ہے کہ گولڈزیہر نے خود ہی اس روایت کو پردۂ غموض میں رکھا ہے۔ ایک طرف تو وہ اتنی تحقیق کرتے ہیں کہ ابوالجلد کا نام تک تلاش کر کے سامنے لے آتے ہیں اور دوسری طرف محض اتنا ہی اشارہ کرتے ہیں کہ کچھ اقوال ابن عباس سے ایسے بھی منقول ہیں جن میں وہ اہل کتاب سے روایات بیان کرنے کی ممانعت فرماتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ ان اقوال میں سے چند ایک کو تحقیق کر کے پیش کر دیا جاتا؟

عبداللہ بن عباس کا پوچھنا نہ تو کسی عقیدے سے متعلق ہوتا تھا اور نہ ایسی باتوں کے بارے میں ہوتا تھا جو اصولِ دین سے متعلق ہوتی تھیں۔ وہ اہل کتاب سے ازمنۂ سابقہ اور امم سابقہ کے بارے میں کسی قصے کی وضاحت پوچھ لیا کرتے تھے۔ جو چیز عقل و دین کے موافق ہوتی تھی اور جس سے عبرت و

---

۲۲ مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۸۵-۸۶۔ عربی ترجمہ ڈاکٹر عبدالحلیم النجار مطبوعہ مکتبۃ الخانجی مصر ۱۹۵۵ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موعظت حاصل ہوتی تھی، اس کی تصدیق کرتے تھے اور جو اس کے خلاف ہوتی تھی اسے رد کر دیتے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر وہ تورات کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عظیم صحابی جنھیں ترجمان القرآن بھی کہا گیا ہے دراصل قرآن و تورات کا تقابلی مطالعہ کرتے تھے اور ان اشیا کی تلاش میں رہتے تھے جن سے قرآنی عقاید و اعمال کی تصدیق ہوتی تھی۔ جو چیز قرآن یا شریعتِ اسلام کے خلاف ہوتی اسے ابن عباس جیسا انسان کیسے روایت کر سکتا تھا؟ ایسی چیزیں اہل کتاب سے روایت کرنے کے وہ خود سخت ترین مخالف تھے۔ مثلاً بخاری میں روایت ہے:

انّ ابن عباس قال کیف تسألون اھل الکتاب عن شیٔ؟ وکتابکم الذی انزل اللہ علی رسولہ احدث تقرؤنہ محضاً لم یشب وقد حدثکم ان اھل الکتاب بدلوا کتاب اللہ وغیروہ وکتبوا بایدیھم الکتاب وقالوا ھو من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً، الا ینھاکم ما جاءکم من العلم۔ عن مسألتھم لا واللہ ما رائینا منھم رجلاً یسألکم عن الذی انزل علیکم[۲۳]

ابن عباس نے کہا تم کس چیز کے بارے میں اہل کتاب سے کیسے پوچھتے ہو جب کہ وہ کتاب جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری ہے، بالکل نئی ہے اور جسے تم ایک خالص اور پاک شکل میں پڑھتے ہو۔ اس کتاب نے تمھیں بتایا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا ہے، اس میں تغیر کر دیا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس طرح وہ اس کے بدلے معمولی سی قیمت وصول کر سکیں۔ کیا تمھارے پاس جو علم آیا ہے اس نے تم کو اہل کتاب سے پوچھنے سے منع نہیں کیا؟ نہیں خدا کی قسم ہم ان اہلِ کتاب میں سے ایک آدمی بھی نہیں دیکھتے جو اس چیز کے بارے میں تم سے پوچھے جو اللہ نے تم پر نازل کی ہے۔

اس روایت کو سامنے رکھ کر کیا احمد امین اور گولڈزیہر کے دعاوی کو قبول کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام خاص کر ابن عباس اہل کتاب سے ہر چیز پوچھا کرتے تھے اور بلا چون و چرا ہر قسم کی روایت کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ کیا اس طرح وہ نبی پاک کی تنبیہ کے برعکس عمل کیا کرتے تھے؟ جہاں تک ابو الجلد

۲۳؎ کتاب الاعتصام باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تسئلوا اھل الکتاب عن شیٔ۔ کتاب الشھادات باب لا یسئل اھل الشرک عن الشھادۃ وغیرھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والی روایت کا تعلق ہے تو غالباً اس دعوے کی بنیاد طبری کی تفسیر ہے۔ سورۂ رعد کی آیت: "هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا" کے تحت طبری مثنیٰ سے روایت بیان کرتے ہیں:

قال حدثنا حجاج قال حدثنا حماد قال اخبرنا موسیٰ بن سالم ابوجہضم مولی ابن عباس قال کتب ابن عباس الی ابی الجلد یسألہ عن البرق فقال البرق الماء[24]

ابن عباس نے ابوالجلد کی طرف لکھا کہ برق کے کیا معنی ہیں۔ اس نے کہا برق کے معنی ہیں پانی۔

یہ سند منقطع ہے، کیونکہ موسیٰ بن سالم ابوجہضم نے ابن عباس کو نہیں پایا اور نہ وہ ان کا مولی تھا۔ ابن عباس سے مرسل بیان کرتا ہے۔ یہ تو عبداللہ بن عبیداللہ بن عباس سے روایت کرتا ہے دونوں حمادوں اور امام ابوجعفر الصادق سے روایت کرتا ہے۔ یہ عباسیوں کا مولی تھا[25] طبری سے شاید سہو ہوا ہے کہ اسے ابن عباس کا مولی کہہ دیا یا یہ کتابت کی غلطی ہے۔

مندرجہ بالا روایت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ابن عباس نے کوئی عقیدہ یا احکام سے متعلق بات نہیں پوچھی۔ وہ صرف مظاہرِ فطرت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی ثابت نہیں ہے کہ ابن عباس نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔

بہرحال یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر صحابہ کرام اہلِ کتاب سے معلومات حاصل کرتے تھے۔ وہ اس دائرۂ جواز کے اندر رہ کر ہی اہل کتاب کی باتیں سنتے تھے جو آنحضرت نے ان کے لیے کھینچ دیا تھا۔ لیکن صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں اس حدِ جواز سے بعض قدم آگے نکل گئے۔ اس دور میں اہلِ کتاب سے بعض بے مقصد اور متناقض روایات اخذ کی گئیں۔ ہماری تفاسیر میں ایسا مواد جمع ہو گیا جس سے روحِ قرآن متاثر ہوئی۔ عہدِ تابعین میں اسرائیلیات سے اعتنا کرنے والے وہب بن منبہ (م ۱۱۰ھ) اور عبدالملک ابن عبدالعزیز ابن جریج (م ۱۵۰ھ) تھے۔ علمائے جرح و تعدیل نے ان پر سخت تنقید

---

[24] جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۱۳، ص ۱۲۳۔

[25] ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۲۱۰۔ الطبعۃ الاولیٰ مطبعۃ السعادۃ۔ بجوار محافظ مصر لصاحبہا محمد اسماعیل ۱۳۲۵ھ۔ خلاصہ تذہیب الکمال، ص ۳۳۴ الطبعۃ الاولیٰ مطبعۃ الخیریہ مالکہا و مدیرہا عمر حسین الخشاب ۱۳۲۲ھ۔ مکتبہ القاہرہ، لصاحبہا علی یوسف سلیمان شارع الصنادقیہ مصر ۱۳۷۲ھ۔ الطبعۃ الرابعۃ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے ہمارے ضابطہ و عادل علمائے کرام نے سعیِ بلیغ سے ہر کھرا اور کھوٹا ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ مصر کے مشہور عالمِ دین شیخ رشید رضا نے وہب بن منبّہ کی روایات کو قابلِ اعتنا نہیں گردانا[۲۶]۔ ابن جریج کے بارے میں احمد بن حنبل کہتے ہیں "جن احادیث کو ابن جریج مرسل بیان کرتے ہیں، وہ سب موضوع ہیں۔ انھیں یہ پروا نہیں ہوتی تھی کہ انھوں نے حدیث کہاں سے لی ہے، یعنی کہتے ہیں، مجھے فلاں کی طرف سے خبر دی گئی ہے یا حدیث بیان کی گئی ہے۔"[۲۷]

اسی طرح تابعین میں مقاتل بن سلیمان (م ۱۵۰ھ) ہیں۔ ان کے بارے میں ابوحاتم کہتے ہیں: "انھوں نے یہود و نصاریٰ سے علوم حاصل کیے اور انھیں قرآن کے موافق بنانے کی کوشش کی۔"[۲۸]

مثلاً سورہ اسرا کی آیت ۵۸ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا (اور ہر گاؤں کو ہم قیامت کے دن سے قبل تباہ کرنے والے ہیں یا ان کو ایک سخت عذاب دینے والے ہیں)۔ اس کے بارے میں مقاتل کہتے ہیں "اس آیت کی تفسیر کے لیے میں نے ضحاک بن مزاحم کی کتاب دیکھی ہے کہ مکہ کو اہلِ حبشہ تباہ کریں گے، مدینہ قحط کی وجہ سے برباد ہوگا، بصرہ غرق ہو جائے گا، کوفے پر ترک دھاوا بولیں گے، جبل کے مقام پر بجلیاں کوندیں گی اور زلزلے آئیں گے، خراسان پر بے شمار قسم کی ہلاکتیں اور تباہیاں نازل ہوں گی، اس کے آگے انھوں نے چین اور ہند سے لے کر تمام شہروں کے نام گنوائے ہیں، حتیٰ کہ قسطنطنیہ اور تدمر کے نام بتائے اور ان کی بربادیوں کے اسباب بیان کیے ہیں[۲۹]۔ سب باتیں ہماری بعض تفاسیر میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل نے کہا تھا "تین کتابیں ایسی ہیں جن کا کوئی اصل نہیں ہے.. مغازی، ملاحم اور تفسیر"[۳۰]۔ اسرائیلیات کی کثرت کا اندازہ صرف اسی بات سے

---

۲۶ تفسیر المنار، ج ۱، ص ۷، ۸، ۹، ۱۰۔

۲۷ میزان الاعتدال، ج ۲، ص ۱۵۔

۲۸ وفیات الاعیان، ج ۲، ص ۵۶۸۔

۲۹ روح المعانی، ج ۵، ص ۱۰۰۔ علامہ آلوسی ادارہ الطباعۃ المنیریہ مصر سن ندارد۔

۳۰ الاتقان، ج ۲، ص ۱۷۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگایا جا سکتا ہے کہ ان سے وہ تفاسیر بھی نہ بچ سکیں جن کو تفاسیر بالرائے کہا جاتا ہے اور جن میں عموماً عقل و استنباط سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ بقول ابن خلدون: "متقدمین نے اسرائیلیات سے اپنی تفاسیر کو بھر دیا ہے۔ ان میں ہر قسم کا رطب و یابس اور مقبول و مردود موجود ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اہلِ عرب نہ تو اہلِ کتاب تھے اور نہ اہلِ علم تھے۔ وہ بدوی زندگی کے خوگر تھے، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے: جب کبھی بشری تقاضوں کے تحت انھیں اسباب کائنات، ابتدائے آفرینش اور اسرارِ وجود کے بارے میں کچھ جاننے کا شوق پیدا ہوتا تو اہلِ کتاب سے پوچھتے تھے اور انہی سے علمی استفادہ کرتے تھے۔ یہ اہلِ تورات یہود تھے یا نصاریٰ تھے۔ نصاریٰ بھی یہودیوں کے دین پہ چلتے تھے۔ پھر اس دور کے اہلِ تورات عربوں ہی کی طرح بدّو تھے۔ ان کی معلومات اتنی ہی ہوتی تھیں جو اہل تورات میں ایک عام آدمی کی ہوتی ہیں۔ اہلِ تورات کا زیادہ حصہ حمیر سے تعلق رکھتا تھا۔ سب سے پہلے حمیر والوں نے دین یہودیت اختیار کیا تھا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو انھوں نے شرعی احکام کے سوا باقی تمام باتیں زمانۂ قبل از اسلام کی اپنائے رکھیں۔ مثلاً ابتدائے کائنات کے بارے میں معلومات اور مختلف واقعات اور جنگوں کے اسباب کے بارے میں ان کے تصورات وہی پرانے تھے۔ عرب کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام سے معلومات حاصل کرتے تھے اور ان حضرات کی منقولات تفاسیر میں درج کی گئیں۔ چونکہ یہ مسائل احکام سے تعلق نہیں رکھتے تھے، لہذا ان کے بارے میں صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ مفسروں نے تساہل سے کام لیا، ان کی بنیاد جیسا کہ ہم نے پہلے کہا یہی اہلِ کتاب تھے جو بدوی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی معلومات کی کوئی سند یا بنیاد نہیں تھی، مگر اس کے باوجود انہی کی شہرت تھی اور ان کی بہت قدر و منزلت کی جاتی تھی، محض اس لیے کہ وہ دین و ملت کے مقامِ بلند پر فائز تھے۔ لہذا ان کی باتوں کو اس دور میں اہمیت دی گئی[۱۳۵]

لہذا قرآن کے ہر طالب علم پر فرض ہے کہ وہ تفاسیر کا مطالعہ کرتے وقت نہایت بیدار مغزی اور تنقیدی روح سے کام لے، تاکہ وہ اس بحرِ ذخار کی تہہ سے ہیرے اور جواہرات نکال سکے۔ جو چیز عقل و

---

[۱۳۵] مقدمہ المجلد الاول، ص ۷۸۶ - ۷۸۷ الطبعۃ الثانیہ مکتبۃ المدرسۃ و دار الکتاب اللبنانی للطباعۃ والنشر بیروت ۱۹۶۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقل اور روحِ اسلام کے مطابق ہو اسے لے لے، جو چیز اسلامی شریعت کی نقیض ہو اور عقل کے خلاف ہو اسے رَد کر دے اور اگر اہلِ کتاب کی کوئی ایسی روایت ہے جو شریعتِ اسلامی کے مخالف ہے اور نہ موافق، اس کے بارے میں توقف اختیار کرے۔ صدق و کذب کا حکم نہ لگائے، قرآن کا ہر طالب علم ان روایات میں سے اسی قدر اخذ کرے جو قرآنی سچائیوں کی شاہد ہو۔

© rasailojaraid.com